chapter. 6

باب ششم

سیاسی نظریات

۱۔ مولانا آزاد کا قومی یکجہتی کا تصور

۲۔ مولانا آزاد۔ ایک سیاسی مبصّر

۳۔ سیاسی نظریہ

باب ششم

سیاسی نظریات

۱. مولانا آزادؔ کا قومی یکجہتی کا تصور:

قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کے تصور اوراس کے معنیٰ و مفہوم پر ہندوستان کے بہت سے مشاہیر علماء و مفکرین نے روشنی ڈالی ہے اور اس کے معنی و مفہوم کو واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ڈاکٹر تاراچند نے قومیت کے تصور اور انسانوں کے قومی شعور پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے۔

"قومی شعور صبح کے سورج کی روشنی کی طرح پھیلتا ہے۔ سب سے پہلے یہ اعلیٰ ذہن رکھنے والے ترقی پسند انسانوں کے دلوں کو متوثر کرتا ہے۔ اس کے بعد یہ وسیع تر دائروں میں پھیلنا شروع کرتا ہے۔۔۔ قوم محض انسانوں کا اجتماع نہیں بلکہ زندگی کے اعلیٰ تر مقاصد کے حصول کے لئے ذہنوں کی باہمی قرابت کا نام ہے۔"(۱)

یہ بات عالم آشکار ہے کہ مولانا آزادؔ ایک اعلیٰ ذہن و کردار کے مالک تھے۔ اُن کا تعلق ایک ایسے مذہبی خاندان سے تھا جو صدیوں سے رشدو ہدایت کا مرکز رہا تھا۔ ایسے مذہبی ماحول میں تربیت پانے کے بعد ان میں عالی ظرفی ،وسیع النظری اور کشادہ دلی کا پیدا ہو جانا کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ انہوں نے بچپن ہی سے اپنے مذہب کی پابندی کے ساتھ دوسرے مذاہب کا احترام کرنا بھی سیکھ لیا تھا۔ وہ زبر دست عالم دین تھے۔چنانچہ انہوں نے مذہب کا گہرائی سے مطالعہ کیا تھا اور قرآنی تعلیمات کی روشنی میں انہوں نے بخوبی یہ سمجھ لیا تھا کہ مذہب، سیاست کی راہ میں حائل نہیں ہے اور قومی یکجہتی دراصل انسانیت سے محبت اور اخوت کا نام ہے، جس کی تعلیم ہمیں قرآن حکیم دے رہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں ۔

" اگر تمام عالم ہمارا وطن ہے اور اس لئے محترم ہے تو وہ خاک تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترام و محبت کی مستحق ہے جس کی آب و ہوا میں ہم صدیوں سے پرورش پا رہے ہیں۔ اگر تمام

---

(۱) قومی یکجہتی اور سیکولرازم ۔ ڈاکٹر تاراچند ۔ مترجم شمیم حنفی (ص۔ ۲۹۳)

فرزندان انسانیت ہمارے بھائی ہیں تو وہ انسان تو بدرجہ اولیٰ ہمارے احترام و اخوت کے مستحق ہیں جو اس خاک کے فرزند اور مثل ہمارے اسی کی سطح پر بسنے والے ،پانی پینے والے اور اسی محبوب فضا کے پیار کرنے والے ہیں۔" (۲)

مولانا آزاد نے خالص اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قومی یکجہتی اور متحدہ قومیت کے تصور کو سمجھنے کی سعی کی ۔جب انہوں نے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا تب بھی ان کے ذہن پر مذہبیت کا رنگ غالب تھا۔ چنانچہ اس میدان میں بھی انہوں نے اسی نظریے کی تبلیغ کی کہ مذہب اتحاد سکھاتا ہے اور نااتفاقی سے قومیں تباہ ہوجاتی ہیں۔ قومی یکجہتی کے انہی تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انہوں نے صحافت کو اپنایا۔ "الہلال" کے ذریعے انہوں نے ملک و ملت کی تعمیری خدمات انجام دیں اور ہندو مسلم اتحاد قائم کرنے کی کوششیں کیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے قریب لانے کی بھرپور جدو جہد کی۔ اپنے ہر قول و فعل سے انہوں نے اپنے قومی یکجہتی کے تصور کو عام کیا۔ اپنے ایک خطبہ میں انہوں نے فرمایا۔

"درحقیقت اسلام کے نزدیک وطن و مقام اور رنگ و زبان کی تفریق کوئی چیز نہیں۔ اگرچہ رنگ اور زبان کی تفریق کو وہ ایک الٰہی نشان ضرور تسلیم کرتا ہے، لیکن اس کو وہ کسی انسانی تفریق و تقسیم کی حد قرار نہیں دیتا اور انسان کے تمام دنیوی رشتے خود انسان کے بنائے ہوئے ہیں۔ اصلی رشتہ صرف ایک ہے اور وہ وہی ہے جو انسان کواس کے خالق اور پروردگار سے متصل کرتا ہے۔ وہ ایک ہے، پس اس کے ماننے والوں کو بھی ایک ہی ہونا چاہئے۔ اگرچہ سمندروں کے طوفانوں، پہاڑوں کی مرتفع چوٹیوں، زمین کے دور دراز گوشوں اور جنس و نسل کی تفریقوں نے ان کو باہم ایک دوسرے سے جدا کر دیا ہو۔" (۳)

اس اقتباس سے مولانا آزاد کے قومی یکجہتی کے تصورات کی وضاحت ہوتی ہے کہ وہ خالص قرآنی تعلیمات کی روشنی میں مذہب اسلام کا سرا عالم انسانیت سے ملاتے ہیں اور انہی اخلاقیات کی حدوں کو آگے بڑھا کر سیاست سے جوڑ دیتے ہیں۔ ان کا متحدہ قومیت کا تصور محدود نہیں تھا۔ وہ رنگ وزبان، وطن ومقام اور جنس و نسل کی تفریق سے سخت متنفر تھے ۔ ان کا عقیدہ

---

(۲) ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر ۔دسمبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد کا تصور قومیت ۔ عبدالمغنی (ص۔ ۱۲۱)

(۳)خطبات آزاد ۔ مرتبہ مالک رام۔ کلکتہ ۲۷، اکتوبر ۱۹۱۴ء (ص۔ ۱۶)

تھا کہ قرآن انسانی تفریق و تقسیم کی حدبندی نہیں کرتا۔یہ حدود تو خود انسانوں نے قائم کئے ہیں لہٰذا ان حدود کو توڑ کر مسلمانوں کو دوسری قوموں کے ساتھ محبت، اخوت اور بھائی چارگی سے پیش آنا چاہیئے۔

مولانا آزاد ابتداہی سے ہندوستان کی آزادی کے علمبردار تھے۔ وہ یہ بھی سمجھ چکے تھے کہ جدوجہد آزادی میں ہندوستان کے تمام فرقوں کی شمولیت ضروری ہے۔ چنانچہ ہندوستان کے تمام فرقوں میں باہمی اتحاد پیدا کرنے کے لئے انہوں نے انتھک کوششیں کیں۔ مسلمانوں کی بے حسی اور خام خیالی کو دور کرکے انہیں ہندوؤں کے ساتھ مل جل کر رہنے پر بہت زور دیا۔ مسلمانوں کے نصب العین کی توضیح کرتے ہوئے انہوں نے "الہلال" میں فرمایا۔

"مسلمانوں کا نصب العین خدمت عالم ہے اور وہ انسانیت کے خادم ہیں۔ ان کے لئے خدا کی زمین کا ہر ٹکڑہ مقدس اور اس کے بندوں کا ہر گروہ محترم ہے۔" (۴)

مولانا آزاد جب تحریک آزادی میں عملی طور پر شریک ہوئے تو انہیں قومیت کے سوال کا سامنا کرنا پڑا۔ اس وقت مغرب سے "نیشنلزم" کی اصطلاح ہندوستان میں نئی نئی آئی تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کا ترجمہ "قوم پرستی" کرکے مسلمانوں کو تذبذب میں مبتلا کر دیا تھا۔ مولانا آزاد نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قومیت کے تصور کو ان لفظوں میں واضح کیا۔

"نہ تو اسلام کی وسعت نظر کے یہ معنی ہیں کہ وہ قومیت کے ساتھ جمع نہیں ہوسکتا، نہ قومیت کے لئے اس بات کی ضرورت ہے کہ خواہ مخواہ اسلامی ذہنیت کا دائرہ تنگ کیا جائے۔ یہ دونوں صورتیں افراط و تفریط میں داخل ہیں۔ ہر معاملہ کی طرح یہاں بھی حقیقت اطراف میں نہیں بلکہ وسط میں ڈھونڈنی چاہیئے۔" (۵)

مولانا کے اس بیان کی روشنی میں اس بات کی وضاحت ہوجاتی ہے کہ قومیت "قوم پرستی" نہیں ہے بلکہ انسانوں کے اجتماعی رشتے کی ایک خاص حالت کا نام ہے۔ یہ کوئی مستقل حالت نہیں ہے۔اسلام آفاقیت کا درس دیتا ہے اورانسانی زندگی کے ہر معاملے میں توازن اور اعتدال کا راستہ اپنانے کی تلقین کرتا ہے۔ چنانچہ عصر حاضر میں برطانوی سامراج سے نپٹنے کے

---

(۴) ابوالکلام آزاد۔ احوال و آثار۔ مرتبہ مسعود الحسن عثمانی (ص۔ ۷۵)

(۵) مولانا آزاد (ذہن و کردار) عبدالمغنی (ص۔ ۴۹)

لیے متحدہ قومیت اور ملک گیر جدوجہد کی ضرورت ہے۔نئے حالات میں نئے آفاقی نظریے کی ضرورت ہوگی ۔ اس طرح انہوں نے قومیت کا سرا انسانی یک جہتی سے ملا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ عصر حاضر میں ملک کی آزادی سے انسانیت کی نئی اور بہتر تعمیر و تشکیل ہو سکتی ہے ۔ مولانا آزاد قومیت کی مزید توضیح و تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

"میرا عقیدہ ہے کہ ہندوستان میں ہندوستان کے مسلمان اپنے بہترین فرائض انجام نہیں دے سکتے، جب تک وہ احکام اسلامیہ کے ماتحت ہندوستان کے ہندوؤں سے پوری سچائی کے ساتھ اتحاد و اتفاق نہ کرلیں ۔یہ اعتقاد قرآن مجید کی نصِّ قطعی پر مبنی ہے۔" (۶)

مولانا آزاد نے مسلمانوں کو احکام شرعیہ پر پابند رہنے کی تاکید کی اور ساتھ ہی ہندو مسلم اتحاد کی پر زور تائید بھی کی۔ ان کے نزدیک یہ فعل عین مذہب کے مطابق تھا۔

۱۹۲۰ء میں مولانا آزاد کی ملاقات گاندھی جی سے ہوئی جوان کی سیاسی زندگی میں بڑی اہمیت کی حامل ہے۔ ان دو عظیم شخصیتوں کے باہمی ملاپ کا ذکر کرتے ہوئے قاضی عبد الغفار یوں رقمطراز ہیں۔

"دو غیر معمولی فطرتوں کا سنگم اپنی ایک عجیب خصوصیت رکھتا تھا۔۔۔ جس طرح مولانا نے ،اسی طرح مہاتما جی نے سیاست کو مذہبی روحانیت کی کسوٹی پر رکھ دیا تھا۔دونوں اپنی اپنی جگہ ایک خاص مذہبی حیثیت رکھتے تھے۔۔۔ یہ واقعہ بجائے خود اس حقیقت کا ترجمان ہے کہ شخصی مذہب ہندوستان کی مشترکہ تہذیب اور مشترکہ قومیت کے تصورات میں رخنہ انداز نہیں ہوسکتا۔"(۷)

حالانکہ گاندھی جی کٹر ہندو تھے۔اور مولانا آزاد "پکے" مسلمان ۔لیکن دونوں قومی رہنماؤں کے باہمی سنگم نے قومی یکجہتی کی مثال قائم کردی ۔ دونوں رہنما اس بات پر متفق تھے کہ ملک و قوم کی اجتماعی زندگی میں کوئی حد بندی نہیں ہوناچاہیے۔ ہندوستان کے اس دور انتشار میں ایک طرف مولانا آزاد قومی یکجہتی پر زور دے رہے تھے تو دوسری طرف مسلمان مسلم لیگ کے سربراہ قائد اعظم محمد علی جناح سے متاثر تھے ۔محمد علی جناح کے قومی تعلیم و تبلیغ کی روح خود انہی کے

---

(۶) خطبات آزاد ۔ مرتبہ مالک رام ۔ آگرہ ۔ ۲۵ ، اگست ۱۹۲۱ء (ص ۔ ۴۷)

(۷)مولانا ابوالکلام آزاد(شخصیت ، سیاست اور پیغام) رشید الدین خان (ص۔ ۳۳)

لفظوں میں یہ تھی۔

"میں ہندو مسلم اتحاد کا حامی ہوں لیکن اتحاد وہ ہو جو مسلم قوم کی حقیقی حفاظت کے اطمینان کے ساتھ ہو اور میرا نصب العین یہ ہے کہ انگریز ہندوستان پر قبضہ رکھنا چاہتا ہے اور گاندھی جی مسلمانوں پر مسلط ہونے کے تمنائی ہیں۔ لیکن ہمیں دونوں کی محکومی منظور نہیں۔ ہم آزاد رہنا چاہتے ہیں۔" (۸)

درج بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ محمد علی جناح کا نظریۂ قومیت محدود تھا اور وہ بغیر کسی کدو کاوش کے فرار کا راستہ اختیار کرنا چاہتے تھے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد قومیت کو آفاقیت سے تعبیر کرتے ہیں اور اپنے قومی یکجہتی کے تصور کو وسیع عالمی تناظر میں دیکھتے ہیں۔ ۱۹۴۰ء میں انڈین نیشنل کانگریس کے ایک اجلاس میں انہوں نے کہا تھا۔

"اسلام کی روح مجھے اس سے نہیں روکتی بلکہ اس میں میری رہنمائی کرتی ہے۔ میں فخر کے ساتھ محسوس کرتا ہوں کہ میں ہندوستانی ہوں اور ہندوستان کی ایک ناقابل تقسیم متحدہ قومیت کا ایک ایسا اہم عنصر ہوں جس کے بغیر اس کی عظمت کا ہیکل ادھورا رہ جاتا ہے"۔ (۹)

درحقیقت مولانا آزاد متحدہ قومیت کے ذریعے جمہوریت اور مساوات انسانی کا حل تلاش کرنا چاہتے تھے۔ ملک میں پھیلے ہوئے انتشار کو مدِ نظر رکھ کر انہوں نے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو للکارا۔ ماضی کی تاریخ کے اوراق پلٹ کر انہوں نے مسلمانوں کو ان کے اسلاف کے کارنامے یاد دلائے۔ متحدہ قومیت کے متعلق ان کا خیال تھا کہ ایسے سانچے قدرت کے مخفی ہاتھوں سے صدیوں میں خود بخود بنا کرتے ہیں۔ ایسے سانچے بنائے نہیں جاسکتے۔ چنانچہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ہندوؤں کے ساتھ باہمی اتحاد قائم کرکے ہندوستان کی جد وجہد آزادی میں ان کا ہاتھ بٹائیں۔ وہ قومی یکجہتی کو ملک کی آزادی کے ساتھ عالم انسانیت کی فلاح کے لئے بھی ناگزیر سمجھتے تھے۔ انہوں نے محض ہندوستان کے سیاسی حالات سے نبرد آزما ہونے کے لیے ہی قومی یکجہتی پر زور نہیں دیا تھا بلکہ وہ اسے مسلمانوں کا مذہبی فریضہ سمجھتے تھے۔ جب ان کی انتہائی کاوشوں سے ہندو مسلم اعتماد بحال ہو گیا تو انہوں نے اپنے اس خیال کی توضیح کرتے ہوئے فرمایا۔

---

(۸) مسلم لیگ۔ قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح۔ مولفہ مولوی خدا بخش اظہر امر تسری (ص۔ ۱۴)

(۹) خطبات آزاد۔ مرتبہ مالک رام۔ رام گڈھ۔ مارچ ۱۹۴۰ء (ص۔ ۲۹۷)

" بہر حال ہندو مسلمانوں کے اتفاق کے سلسلے میں آپ کے سامنے یہ حقیقت لانا چاہتا تھا کہ اگر مسلمانوں نے محبت کا ہاتھ، یکجہتی کا ہاتھ، رفاقت کا ہاتھ اپنے ہمسایوں کی طرف بڑھایا ہے تو ان کا یہ عمل محض کوئی وقتی اور دفاعی نہیں ہے۔ پولٹیکل چال نہیں ہے بلکہ ان کو یقین کرنا چاہئے کہ مسلمانوں نے محبت کا آغوش خود نہیں کھولا ہے بلکہ ان کو خدا نے ،ان کے قوانین شریعت نے کھلوایا ہے۔"(۱۰)

مولانا آزاد کے قومی یکجہتی کا تصور محدود نہیں بلکہ آفاقی تھا۔ وہ عام سیاستدانوں کی طرح قومی یکجہتی کو وقتی اور دفاعی سیاسی ضرورت نہیں سمجھتے تھے بلکہ اسے خدا کا قانون سمجھتے تھے جس پر عمل کرنا ہر انسان کا فرض عین ہے۔ان کی ساری زندگی ہندو مسلم اتحاد کا نمونہ تھی۔ انہوں نے اس اتحاد کے لئے خود بھی جدو جہد کی اور ہندوستانیوں کو بھی اسکی ترغیب دلائی۔ قومی یکجہتی ان کے لیے متاع گراں بہا تھی۔ اسے وہ کسی قیمت پر کھونا نہیں چاہتے تھے ۔یہاں تک کہ اس کے بدلے میں انہیں ملک کی آزادی کو بھی ٹھکرا دینا منظور تھا ۔اس سلسلے میں مولانا آزاد خود تحریر فرماتے ہیں۔

"آج اگر ایک فرشتہ آسمان کی بلندیوں سے اتر آئے اور قطب مینار پر کھڑے ہو کر یہ اعلان کردے کہ سوراج چوبیس گھنٹے کے اندر مل سکتا ہے، بشرطیکہ ہندوستان کے ہندو مسلم، اتحاد سے دست بردار ہو جائیں تو میں سوراج سے دست بردار ہو جاؤں گا کیونکہ اگر سوراج ملنے میں تاخیر ہوئی تو یہ ہندوستان کا نقصان ہوگا لیکن اگر ہمارا اتحاد جاتا رہا تو یہ عالم انسانیت کا نقصان ہے"۔(۱۱)

ہندوستان کی تقسیم کے مسئلے پر محمد علی جناح کی طرف سے جب پاکستان کی تجویز مولانا آزاد کے سامنے آئی تو وہ سخت برہم ہوئے اور اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا۔

"پاکستان کی اصطلاح ہی میری طبیعت کے خلاف ہے۔اس کا مطلب تو یہ نکلتا ہے کہ دنیا کے کچھ حصے ناپاک ہیں جب کہ کچھ پاک ہیں۔ پاک و ناپاک علاقوں کی یہ تقسیم غیر اسلامی ہے اور راسخ العقیدہ برہمنیت سے زیادہ مطابقت رکھتی ہے جو انسانوں اور ملکوں کو مقدس اور نجس

---

(۱۰) شخصیت، سیاست ، پیغام از رشید الدین خان (ص ۔ ۴۸)

(۱۱) کمال ابوالکلام آزاد ۔ علی جواد زیدی (ص۔ ۳۵)

میں بانٹتی ہے۔ بٹوارہ اسلام کی روح کے ہی منافی ہے، اسلام ایسی کسی تقسیم کو قبول نہیں کرتا اور رسولؐ نے فرمایا تھا کہ اللہ نے پوری دنیا کو میرے لئے مسجد بنایا ہے۔" (۱۲)

مذکورہ اقتباسات کی روشنی میں مولانا آزاد کی مذہب اسلام سے غیر معمولی وابستگی اور راسخ العقیدگی کا پتہ چلتا ہے اور ساتھ ہی ان کے قومی نظریات پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ قومی یکجہتی کو کسی بھی اعتبار سے مجروح نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ بجا طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مولانا آزاد اپنے عہد کے سب سے زیادہ وسیع النظر، کشادہ قلب اور انسان دوست رہنما تھے۔ وہ صحیح معنوں میں ہندوستانی مسلمان تھے۔ بالفاظ دیگر انہیں ہندوستانی اور مسلمان دونوں کہا جاسکتا ہے کیونکہ انہوں نے اسلام دوست ملت پروری کے ساتھ وطن دوستی بھی نبھائی اور ملک کے باشندوں کی سماجی و معاشرتی فلاح اور آزادی کے لئے بھرپور کوششیں کیں۔ وہ مساوات انسانی کے قائل تھے۔ انہوں نے خالص قرآنی تعلیمات کی روشنی میں اخوت انسانی کے عالمگیر تصور سے سب سے پہلے جدید دنیا کو روشناس کرایا۔

در حقیقت عظیم مفکر اور دانشور ہونے کے ساتھ مولانا آزاد نے تاریخ اقوام عالم کا بہت گہرائی سے مطالعہ و مشاہدہ کیا تھا۔اس غائر مطالعے و مشاہدے نے ان پر اس حقیقت کا انکشاف کر دیا تھا کہ اعلیٰ تہذیبی اور انسانی قدریں کسی ایک قوم کی امانت نہیں ہیں بلکہ دنیا کی تمام متمدن اقوام نے اس میں نمایاں خدمات انجام دی ہیں۔ چنانچہ مشترکہ طور پر سبھی اس کے حقدار ا ہیں۔ اسی تاریخی نقطۂ نظر نے انہیں انسان دوست بنادیا جسے ہم ان کے ہیومانزم سے تعبیر کرسکتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے پہلے رہنما ہیں جنہوں نے گاندھی جی سے بھی پہلے قومی یکجہتی کے تصور کو واضح کیا اور ہندو مسلم اتحاد بحال کرنے کی کوشش کی۔ ان کی ان تمام کوششوں میں کسی قیادت کی ہوس یا کسی ذاتی مفادات کے تحفظ کی فکر نہیں تھی بلکہ انہوں نے مخلصانہ طور پر بے لوث اور بے غرض ہو کر ملک و ملت کی خدمت انجام دی۔ وہ اسے اپنا دینی فریضہ سمجھتے تھے۔ ان کی خوبی یہ ہے کہ وہ بیک وقت انسان دوست اور وطن دوست دونوں تھے۔ لیکن انسان دوستی کو سب سے اہم گردانتے تھے۔ انہوں نے قومی یکجہتی کو آزادی پر بھی ترجیح دی کیونکہ آزادی کھودینے سے صرف ایک ملک کا نقصان تھا لیکن قومی یکجہتی اور انسانی اخلاقیات کے فقدان سے پوری عالم

(۱۲) ہماری آزادی۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مکمل متن ۔ تیس برس بعد کی اشاعت) مترجم شمیم حنفی (ص ۔ ۱۹۱)

انسانیت مجروح ہوتی ہے جسے مذہب اسلام کسی صورت میں روا نہیں رکھتا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ہندوستان کی ملی و قومی دونوں سرگرمیوں میں مولانا آزاد کی پیش قدمیاں ان کی عظمت کی ناقابل تردید دلیلیں اور ناقابل فراموش یادگار ہیں۔ انہوں نے مذہب اسلام کی روشنی میں اپنی پوری قوت کے ساتھ متحدہ قومیت کا تصور ملک و ملت کے سامنے پیش کیا۔ وہ فرقہ وارانہ اتحاد کو محض سیاسی ضرورت نہیں بلکہ مستقل انسانی ضرورت خیال کرتے تھے۔ ان کا یہ پیغام دراصل پیام توحید تھا جس میں حریت اور اخوت انسانی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ انہوں نے اسی پیام توحید کے ذریعے عالمی انسانیت کی پرزور حمایت کی لیکن بدقسمتی سے ان کے قومی یکجہتی کے تصور اور ان کے الفاظ کی معنویت کو ان کی زندگی میں پوری طرح سمجھا نہیں گیا اور ہندوستان جس بھیانک دور سے گذرا وہ آج اظہر من الشمس ہے۔

۲. مولانا آزاد. ایك سیاسی مبصر:

مولانا آزاد عظیم دانشور اور سیاسی مبصر تھے۔ وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اپنی غیر معمولی سیاسی بصیرت اور ژرف نگاہی سے سیاست کی وادی میں قدم رکھنے سے پہلے ہی انگریزوں کے چالوں کو بخوبی سمجھ لیا تھا۔انہیں یہ سمجھنے میں کچھ دیر نہیں لگی کہ برطانوی حکومت اپنے ذاتی مفاد کے حصول کے لئے ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کی پالیسی پر عمل کرکے ہندوؤں اور مسلمانوں میں نفاق کا بیج بو رہی ہے۔انہیں یہ اندازہ بھی ہو چکا تھا کہ یہ صورتحال ہندوستان اور ہندوستانی عوام کے لئے سمّ قاتل ثابت ہوسکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنے ابتدائے شعور ہی سے اس حقیقت کو محسوس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کو سر سید احمد خان کی مصلحت آمیز قومی پالیسی کو ترک کرکے سیاسی تحریک میں حصہ لینا چاہئے۔ ان کا خیال تھا کہ اگر مسلمان جد وجہد آزادی کے قومی دھارے میں شریک نہ ہونگے تو ہندوستان کی آزادی کا خواب کبھی پورا نہیں ہو سکے گا۔ انہوں نے یہ بھی سمجھ لیا تھا کہ ہندو مسلم خلیج جتنی زیادہ بڑھے گی اتنی ہی برطانوی حکومت مضبوط و مستحکم ہوگی اور ہندوستان فرنگی تسلط سے آزاد نہیں ہوسکے گا۔چنانچہ وہ مسلمانوں کو تحریک آزادی میں شریک کرنے کے لئے کمربستہ ہوگئے۔انہوں نے لکھا۔

”ایک چراغ جو روشن ہو کر نہیں بجھتا وہ حریت صحیحہ کا چراغ ہے۔ مسلمان ہندوستان میں

رہتے ہیں۔ ہندوستان کی خدمت ان کا دینی فرض ہے جس کی بجاآوری لازم ہے، انہوں نے جس جوش و ایثار سے جنگ طرابلس، بلقان اور مسجد کانپور کے معاملے میں حصہ لیا تھا، اس معاملے میں بھی اسی طرح حصہ لیں۔"(۱)

یہ مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت ہی تھی جس نے مسلمانوں کو تحریک آزادی میں حصہ لینے کو ضروری سمجھا، انہیں بیدار کرنے کی کوشش کی اور ہندوستان کی خدمت کوان کا دینی فریضہ بتایا۔

۱۹۰۵ء میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مستقل خلیج پیدا کرکے انہیں کمزور کرنے کی غرض سے لارڈ کرزن نے تقسیم بنگال کا منصوبہ بنایا۔اس وقت مسلمان انگریزوں کی چالوں سے ناواقف تھے اور تحریک آزادی کے خلاف ان کا آلۂ کار بنے ہوئے تھے۔نتیجے کے طور پر ہندو مسلمانوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے اور بنگال کے انقلابی رہنما مسلمانوں پر اعتماد نہیں کرتے تھے۔ مولانا آزاد سیاسی مبصر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جدوجہد آزادی میں تمام فرقوں کی شمولیت ضروری ہے۔ چنانچہ وہ بنگال کے انقلابیوں سے ملے اور انہیں یقین دلایا کہ مسلمان ان کے دشمن نہیں ہیں۔ انہوں نے یہ وضاحت بھی کی کہ اگر مسلمان اس سیاسی تحریک سے بے تعلق رہے تو آزادی حاصل کرنے کا خواب بے تعبیر ہی رہے گا۔

مولانا آزاد کی دوچار ملاقاتوں اور مدلل باتوں کا انقلابی رہنماؤں پر خاطر خواہ اثر ہوا۔رفتہ رفتہ ان کا اعتماد بحال ہو گیا اور دونوں قومیں ساتھ مل کر کام کرنے لگیں۔یہی نہیں بلکہ ان کے مشورے سے انقلابیوں کی خفیہ جماعتیں جو صرف بنگال اور بہار تک ہی محدود تھیں،صرف دو سال کے اندرملک کے مختلف علاقوں میں قائم ہو گئیں۔ کچھ ہی دنوں میں مولانا آزاد نے اپنی دوراندیشی سے یہ بھی محسوس کر لیا کہ انقلابیوں کا دائرۂ کار بہت محدود ہے۔

۱۹۰۸ء میں مولانا آزاد عراق،مصر اور ترکی کے سفر پر گئے۔ وہاں کچھ عراقی انقلابیوں سے ان کی ملاقات ہوئی اور قاہرہ میں "ینگ ٹرکش" مرکز سے ان کے تعلقات قائم ہو گئے۔ مولانا نے ان سے ہندوستان کی آزادی سے متعلق تبادلۂ خیال کیا۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں۔

"وہاں کے انقلابیوں کواس امر پر حیرت تھی کہ ہندوستان کے مسلمان قومی تحریک سے الگ تھلگ رہتے ہیں۔ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو ہندوستان کی آزادی میں رہنمایانہ حصہ لینا

---

(۱) ابوالکلام آزاد (احوال و آثار) مرتبہ مسعود الحسن عثمانی (ص۔ ۷۵)

چاہیے"۔(۲)

ان تحریکی رہنماؤں سے تبادلہ خیال کے بعد مولانا آزاد کو یقین ہو گیا کہ ہندوستان کی تحریک آزادی میں مسلمانوں کا شامل ہونا ضروری ہے۔چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کوخواب غفلت سے بیدار کرنے اور ان میں انقلابی جذبہ پیدا کرنے کا عزم مصمم کر لیا۔ انہوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ اپنے پیغام کو عوام تک پہنچانے کا موثر ترین ذریعہ اخبار ہے۔لہٰذا انہوں نے ہندوستان واپس آکرانہی مقاصد کے حصول کے لئے ۱۹۱۲ء میں ہفت روزہ "الہلال" جاری کیا۔

مولانا آزاد غیر معمولی سیاسی بصیرت کے مالک تھے۔انہوں نے"الہلال" جاری کرنے سے پہلے اس امر کا اندازہ بھی کر لیا تھا کہ مذہب ہی کے راستے مسلمانوں کے دل میں اتر کرانقلاب ممکن ہے۔ لہٰذا انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں "الہلال" کے ذریعے عوام سے خطاب کیا۔ مسلمانوں کو متنبہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔

"اسلام کسی حال میں جائز نہیں رکھتا کہ مسلمان آزادی کھوکر زندگی بسر کریں۔ مسلمانوں کو مٹ جانا چاہئے یا آزاد ہوجانا چاہیے، تیسری راہ اسلام مین کوئی نہیں"۔(۳)

"الہلال" کے ذریعے انہوں نے مسلمانوں کو خواب غفلت سے جھنجھوڑنے کی کوشش کی۔ ان کا خیال تھا کہ اسلام مسلمانوں سے بہت سے مطالبات رکھتا ہے۔ وہ مسلمانوں کی بداعمالیوں پر تاکید کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ کب تک دنیا کو اپنے اوپر ہنسایئے گا اور خود اپنے اعمال پر نہ روئیے گا؟

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت یہ دیکھ رہی تھی کہ مسلمان تحریک سرسیّد سے متاثر ہیں اور ہندوؤں کے ساتھ آزادی کی تحریک میں حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ چنانچہ وہ اس صورت حال کو انتہائی خطرناک سمجھ کر اپنی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں کے ذہنوں سے نقش سرسیّد کو مٹا دینا چاہتے تھے اور ان کے دلوں میں انقلابی جذبہ پیدا کرکے انگریزی تسلط کا خاتمہ کردینا چاہتے تھے۔ "الہلال" میں انہوں نے قومی اتحاد کی وضاحت کرتے ہوئے مسلمانوں کی غیرت و حمیت کو للکارتے ہوئے لکھا۔

---

(۲) مولاناابوالکلام آزاد (شخصیت اور کارنامے) مرتبہ خلیق انجم۔ مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت۔ پروفیسر عابد پشاوری (ص ۔ ۲۱۹)
(۳) قول فیصل (مولاناابوالکلام آزاد) اعتقاد حسین صدیقی (ص۔ ۴)

"یاد رکھئے ہندوؤں کے لئے ملک کی آزادی کے لئے جدوجہد کرنا داخل حب الوطنی ہے مگر آپ کے لئے ایک فرض دینی اور داخل جہاد فی سبیل اللہ۔۔ یقین کیجئے کہ وہ بھی مجاہد ہیں اور ایک ایسے جہاد میں مصروف ہیں جس کے لئے دراصل سب سے پہلے آپ کو اٹھنا تھا۔" (۴)

"الہلال" کی آواز وقت کی آواز تھی۔ چنانچہ یہ جریدہ عوام میں اس قدر پسند کیا گیا کہ ہندوستانی اخباروں میں اب تک کسی اخبار کو اتنی مقبولیت حاصل نہیں ہوئی تھی۔ مولانا آزاد کی بصیرت افروز تحریروں نے مسلمانوں کے ذہن و دماغ کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا اور صرف تین سال کے اندر ہی "الہلال" نے مسلمانوں کی مذہبی اور سیاسی حالت میں حیرت انگیز تبدیلی پیدا کردی۔ اس اخبار کی مقبولیت سے برطانوی حکومت لرزہ بر اندام ہوگئی اور بالآخر حکومت کے عتاب کا شکار ہو کر "الہلال" بند ہوگیا لیکن مولانا آزاد اپنے مشن میں کامیاب ہوگئے۔ اس سلسلے میں وہ خود تحریر فرماتے ہیں۔

"میری یہ صدائیں بیکار نہیں گئیں۔ مسلمانوں نے اب آخری فیصلہ کرلیا ہے کہ اپنے ہندو، سکھ، عیسائی، اور پارسی بھائیوں کے ساتھ مل کر اپنے ملک کو غلامی سے نجات دلائیں۔ (۵)

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد غیر معمولی سیاسی مبصر تھے۔ انہوں نے جنگ آزادی میں مسلمانوں کو شریک کرنے کے لئے سب سے زیادہ لکھا ہے کیونکہ وہ اسے صرف سیاسی ضرورت ہی نہیں بلکہ مذہبی فرض بھی سمجھتے تھے۔

"الہلال" بند ہوجانے کے بعد مولانا آزاد نے رانچی نظر بندی کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں کی اصلاح و بیداری کا جو کام کیا اس نے ایک قلیل عرصے میں ہندوستانی مسلمانوں کے ذہنوں کو متاثر کرنا شروع کردیا۔ انہوں نے اپنے مخصوص زاویۂ نگاہ اور والہانہ اسلوب بیان کے ذریعے مسلمانوں میں ایک ایسی سیاسی بیداری پیدا کردی جس سے ان کے ذہنوں کو نئی جلا ملی جو حکومت برطانیہ کی وفاداری، اس کی حکمت عملیوں کی پشت پناہی اور اس کے مفادات و مصالح کا تحفظ نہیں کرتی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندو مسلم اتحاد بحال ہوا اور مشترکہ طور پر دونوں قوموں نے ۱۹۲۰ء میں مسلمانوں کی تحریک خلافت اور گاندھی جی کی عدم تعاون تحریک میں بڑھ چڑھ کر

---

(۴) کمال ابوالکلام آزاد ۔ علی جواد زیدی (ص ص ۔ ۵۳ ۔ ۵۴)

(۵) آزادی کی کہانی (انگریزوں اور اخباروں کی زبانی) غلام حیدر (ص۔ ۱۷۸)

حصہ لیا۔

۱۹۲۰ء میں ملک کے حالات تیزی سے بدل رہے تھے۔ اسی زمانے میں مولانا آزاد کی گاندھی جی سے ملاقات ہوئی۔ تحریک خلافت کا آغاز بھی اسی زمانے میں ہوا۔ گاندھی جی نے عدم تعاون کی تحریک بھی اسی زمانے میں شروع کی تھی جس کی وجہ سے برطانوی حکومت کو اپنا وجود خطرے میں محسوس ہو رہا تھا۔ چنانچہ گرفتاریاں عمل میں آ رہی تھیں۔ مولانا آزاد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔ اسی دوران کونسل کی ممبری کے سوال پر کانگریس میں پھوٹ پڑ گئی۔ رہائی کے بعد انہوں نے دونوں گروپ میں مفاہمت کی کوششیں کیں اور بالآخر ان کے سیاسی فہم و فراست نے اپنا رنگ دکھایا اور سمجھوتہ ہو گیا۔ اتفاق رائے سے مولانا آزاد کو اس اجلاس کا صدر بنایا گیا۔ اس وقت ان کی عمر صرف پینتیس سال تھی۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ اس وقت تک انتخاب پانے والے تمام صدروں میں وہ سب سے کم عمر تھے۔ یہ انتخاب ان کی دانشوری، فہم و فراست اور سیاسی بصیرت پر دلالت ہے۔

مولانا آزاد اس تیزی سے بدلتے ہوئے دور میں کئی محاذوں پر سرگرم عمل تھے۔ محمد علی جناح نے کانگریس سے علیحدگی اختیار کر کے مسلم لیگ قائم کر لی تھی جو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کی گئی۔ ایک طرف مسلم لیگ مسلمانوں کو ہندوؤں سے متنفر کر رہی تھی تو دوسری طرف ہندوؤں میں کٹر مہا سبھائی "ہندو تشخص" پر اپنا سارا زور صرف کر رہے تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی سیاسی بصیرت سے کام لیتے ہوئے مسلمانوں سے یہ اپیل کی۔

"ہندو اکثریت کا خوف دل سے نکال دیجئے۔ یہ سب سے بڑا شیطانی وسوسہ ہے۔ ہندو مسلم مل کر آزادی کی جنگ لڑیں۔ جب ملک قربانی اور سرفروشی کا جذبہ طے کرے گا تو پھر اس کی طاقت ناقابل تسخیر ہو جائے گی۔" (۶)

مولانا آزاد مسلم لیگ کی قیادت کو قومی سیاست کے لئے خطرناک سمجھتے تھے۔ وہ محمد علی جناح، مولانا محمد علی اور شوکت علی کی جذباتی سیاست سے بھی سراسیمہ تھے کیونکہ ان کے نزدیک مسلم لیگ کا نظریۂ سیاست محدود تھا۔ چنانچہ انہوں نے دہلی میں ۱۲، دسمبر ۱۹۲۳ء کو ایک خطبہ دیتے ہوئے مسلمانوں کو تنبیہ کی۔

---

(۶) فکر و نظر (سہ ماہی) علی گڈھ۔ ابوالکلام آزاد نمبر۔ اگست ۱۹۸۰ء مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی عظمت۔ محمد یٰسین (ص۔ ۹۸)

"آج ہم ایک ایسے وسط میں کھڑے ہیں جس کی ایک انتہا غفلت ہے اور دوسری مایوسی، اگر ہم نے مشکلات کو اصلیت سے زیادہ سمجھا تو یہ غفلت کی طرف اقدام ہوگا اور اگر کم کر کے دیکھا تو اس میں مایوسی کی طرف بڑھ جانے کا اندیشہ ہے۔ ہمیں نہ غافل ہونا چاہئے، نہ خائف۔ ہم کو مقابلہ کرنا چاہئے اور غالب آنا چاہیے لیکن یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ہم مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ کرلیں۔ اس راہ میں ہتھیار سے زیادہ ترازو کی ضرورت ہے۔" (۷)

انہوں نے فرقہ واریت کے سوال پر دہلی کے ایک اور اجلاس میں خطبۂ صدارت دیتے ہوئے کہا کہ "آج ہمیں ہندوستان میں کسی ہندو سنگھٹن کی ضرورت ہے نہ مسلم سنگھٹن کی۔ ہمیں صرف ایک سنگھٹن کی ضرورت ہے اور وہ ہے انڈین نیشنل کانگریس۔" (۸)

مولانا کی ان ولولہ انگیز تقریروں کا اثر یہ ہوا کہ مسلمان ہندوؤں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے لگے اور ہندوؤں نے بھی رواداری سے کام لیا۔ اس اتحاد کا نتیجہ یہ ہوا کہ مسلمان کثیر تعداد میں کانگریس میں شامل ہوگئے۔

اس زمانے میں ملک خطرناک صورتحال سے دو چار تھا۔ ایسے نازک وقت میں قانون حکومت ہند کا نفاذ عمل میں آیا اور صوبوں کو خود مختار کرنے کا اعلان کیا گیا۔ کانگریس کے بعض رہنما انتخابات کے مخالف ہوگئے لیکن مولانا آزاد نے اپنی سیاسی بصیرت سے یہ اندازہ کرلیا کہ اگر صوبائی اسمبلیوں پر ناپسندیدہ عناصر قابض ہوگئے تو ملک کے لئے خطرناک ثابت ہوسکتے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے انتخابات کی حمایت کی اور مخالف گروپ کو سمجھایا کہ انتخابات میں شرکت سے عوام کے سیاسی شعور کو بیدار کیا جاسکتا ہے۔ مولانا کے اس بصیرت افروز خیال سے سبھی رہنما متفق ہوگئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ کانگریس سندھ اور پنجاب کے علاوہ ملک کی سب سے بڑی جماعت بن کر ابھری۔

انتخابات کے بعد کانگریس میں نئے نئے اختلافات شروع ہوگئے۔ کانگریس کے چند اراکین کا خیال تھا کہ صوبہ جاتی خودمختاری سے سارے اختیارات گورنر کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اس کے برعکس مولانا آزاد کی رائے یہ تھی کہ صوبہ جاتی حکومت اپنے محدود اختیارات سے بھی

---

(۷) خطبات آزادی (حصہ اول) عبدالجبار خان (ص ۔ ۲۰۳)

(۸) کمال ابوالکلام آزاد۔ علی جواد زیدی (ص۔ ۳۵)

بھر پور فائدہ اٹھا سکتی ہے۔ کانگریس کو تذبذب میں مبتلا دیکھ کر گورنر نے غیر کانگرسی پارٹیوں کو حکومت بنانے کی دعوت دے دی۔ اس سے وائسرائے پر کانگریسیوں کا اندورنی اختلاف واضح ہوگیا۔ واردھا میں ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا اور حقیقت کے اعتراف میں مولانا آزاد نے کانگریسی لیڈروں کو پس و پیش میں مبتلا دیکھا تو واضح لفظوں میں یہ تجویز پیش کی کہ کانگریس کو عہدے قبول کرلینا چاہیے۔ ان کی رائے کا احترام کیا گیا اور کانگریس نے صوبوں میں وزارتیں بنانے کا فیصلہ کیا۔

مولانا آزاد کی مبصرانہ صلاحیت کا ایک اور نمونہ لاہور میں ہونے والا کانگریس کا اجلاس ہے۔ اس اجلاس کی صدارت کے لئے کانگریس کی صوبائی کمیٹی نے سردار پٹیل کا نام پیش کیا۔ گاندھی جی جنگ آزادی میں درپیش نازک مرحلوں سے واقف تھے۔ چنانچہ انہوں نے جواہر لال نہرو کی صدارت کے لئے حمایت کی۔ اس سے کانگریسی لیڈروں میں اختلاف پیدا ہوگیا۔ بعض لوگوں نے اسے اپنی حق تلفی محسوس کی۔ اس موقع پر بھی مولانا آزاد کی دوراندیشی کام آئی۔ انہوں نے کہا۔

”جواہر ہندو اور مسلم نوجوانوں کو یکساں طور پر اپیل کرے گا اور صدارت کے لئے اس سے موزوں نام نہیں ہے۔“ (۹)

مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت اور سوجھ بوجھ سے کانگریسی ممبران پہلے ہی واقف تھے۔ چنانچہ سب نے ان کی رائے سے اتفاق کیا اور جواہر لال نہرو کی صدارت میں ۲۶، جنوری ۱۹۳۰ء کو دریائے راوی کے کنارے مکمل آزادی کا تاریخی اعلان پڑھا گیا جو بعد میں ہماری جمہوریت کا سنگ بنیاد بنا۔ اس اعلان کا مسودہ تیار کرنے میں مولانا آزاد نے بھی ہاتھ بٹایا۔

دوسری جنگ عظیم کے زمانے میں جب امریکہ اور چین نے برطانیہ پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوستان کو جنگ پر آمادہ کرے۔ اس غرض سے ۱۹۴۲ء میں ہندوستانی لیڈروں سے بات چیت کے لئے کرپس مشن ہندوستان آیا۔ اس مشن کے سربراہ سر سٹیفرڈ کرپس تھے۔ مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ چنانچہ کرپس نے تمام گفت و شنید انہی سے کی۔ اس سلسلے میں مولانا یوں رقمطراز ہیں۔

---

(۹) ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت م۔ م راجندر (ص۔ ۱۳۸)

"جب تک کہ توجہ کے ساتھ میں اس کی جانچ پرکھ نہ کرلوں کہ سر سٹیفرڈ کرپس جو پیش کش لے کر آئے ہیں اس کی صحیح شرطیں کیا ہیں، میں کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ میں بہرحال ان کا خیر مقدم کرونگا اور ایک پرانے دوست کی حیثیت سے کوشش کرونگا کہ جہاں تک ہوسکے ان کے خیالات کو قبول کروں۔" (۱۰)

اس اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کافی غور و فکر کے بعد کوئی حتمی فیصلہ کرتے تھے۔ یہ ان کی سیاسی بصیرت ہی تھی کہ انہوں نے سر کرپس جیسے سیاستدان اور مشہور و معروف وکیل کو اس بات پر آمادہ کرلیا کہ ہندوستانیوں کو جنگ میں حصہ لینے کے عوض مراعات حاصل ہونی چاہئیں اور قومی رہنماؤں کو رہا کیا جانا چاہئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہ گفتگو ناکام ثابت ہوئی۔

۱۹۴۶ء میں جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد برطانیہ میں لیبر پارٹی اقتدار پر آئی۔ اس نے ہندوستان کی آزادی کے سوال پر کیبنٹ مشن قائم کیا۔ سر اسٹیفرڈ کرپس اور لارڈالگزنڈر اس مشن کے سربراہ تھے۔ کانگریس کے صدر کی حیثیت سے مولانا آزاد نے اس مشن کے سامنے یہ معقول تجویز پیش کی کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دی جائے۔ یہ ایک ایسا حل تھا جس سے ملک تقسیم سے بچ سکتا تھا۔

۱۹۴۶ء میں شملہ کانفرنس میں جب مرکز میں عارضی حکومت بنائے جانے اور کانسٹی ٹیوٹ اسمبلی کی تشکیل کے سلسلے میں بات چیت چل رہی تھی اس وقت مولانا آزاد کانگریس کے صدر کے طور پر تھے۔ اس بات چیت میں مخالف فریقین میں محمد علی جناح اور لیاقت علی بھی شریک تھے۔ اس وقت محمد علی جناح نے کچھ ایسے سوالات اٹھائے جس کی وجہ سے بات چیت کا آگے بڑھنا مشکل ہوگیا اور یہ بات محسوس کی جانے لگی کہ جواہرلال نہرو، مولانا آزاد سے کانگریس کی صدارت لے لیں۔ مولانا کو اس بات کا علم ہوتے ہی انہوں نے بخوشی صدارت جواہرلال نہرو کے حوالے کردی اور کہا۔

یہ بات بالکل غیر اہم ہے کہ کانگریس کا صدر میں ہوں یا جواہر۔ ہم دونوں کے خیالات میں کوئی فرق نہیں۔ اہم بات تو یہ ہے کہ شملہ کانفرنس ناکام نہ ہو۔" (۱۱)

---

(۱۰) ہماری آزادی۔ مولانا ابوالکلام آزاد (مکمل متن۔ تیس برس بعد کی اشاعت) مترجم شمیم حنفی (ص۔ ۶۲)

(۱۱) ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت۔م۔م راجندر (ص۔ ۱۳۹)

مذکورہ اقتباسات سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد نے ملک کے حالات کو قابو میں رکھنے کے لئے اپنی ذاتی قربانی سے بھی گریز نہیں کیا۔لیکن بدقسمتی سے جواہر لال نہرو کی صدارت میں ملکی حالات نے کچھ ایسا رخ اختیار کرلیا جس نے ہندوستان کی قسمت کا پانسہ پلٹ کر رکھ دیا۔ ملک کے سیاسی حالات قابو سے باہر ہوگئے۔ مولانا آزاد اپنی تمام تر کوششوں اور قربانیوں کے باوجود بھی ملک کی تقسیم کو نہیں روک سکے۔ اس طرح ہندوستان نے آزادی تو حاصل کر لی لیکن اپنی وحدت کھو دی۔

مولانا آزاد کے بعض ناقدین نے ملک کی تقسیم کے سلسلے میں انہیں ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اگر وہ ایک برس اور عہدۂ صدارت پر رہتے تو شاید ملک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مولانا آزاد خود اس کا اعتراف کرتے ہوئے تیس سال بعد شائع شدہ صفحات میں لکھتے ہیں۔

"میں نے اپنے بہترین اندازے کے مطابق عمل کیا لیکن اس کے بعد جس طرح کے حالات رونما ہوئے ان کے نتیجے میں میں نے محسوس کیا کہ یہ میری سیاسی زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ مجھے اپنے کسی اقدام پر اتنا افسوس نہیں ہوا جتنا کہ اس نازک مرحلے پر کانگریس کی صدارت سے سبکدوش ہونے کے فیصلے پر ہوا۔ یہ ایک غلطی تھی جو گاندھی جی کے لفظوں میں ہمالیائی غلطی کہی جائے گی۔ میری دوسری غلطی یہ تھی کہ جب خود میں نے کھڑے نہ ہونے کا فیصلہ کرلیا تو سردار پٹیل کی حمایت نہ کی۔ ہمارے درمیان کئی معاملوں میں اختلاف تھا مگر مجھے یقین ہے کہ بطور صدر کانگرس اگر وہ میرے جانشین بنتے تو کیبنٹ مشن پلان پر کامیابی سے عمل کراتے۔ ان سے جواہر لال نہرو والی غلطی کبھی نہ ہوتی جس نے مسٹر جناح کو پلان کا ستیاناس کرنے کا موقع دے دیا۔ جب میں یہ سوچتا ہوں کہ اگر میں نے غلطی نہ کی ہوتی تو شاید آخری دس برسوں کی تاریخ کچھ اور ہوتی تو میں خود کو معاف نہیں کر سکتا۔" (۱۲)

مولانا آزاد کی اس ہمالیائی غلطی سے قطع نظر یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ وہ اس تقسیم سے دل برداشتہ ہوگئے اور چاروناچار انہیں وہ سب کچھ دیکھنا پڑا جو وہ نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔

آزادی کے بعد مولانا آزاد نے ہندوستانی مسلمانوں کا اعتماد بحال کرنے کی کوشش کی۔ ان کے دلوں سے خوف و ہراس کو دور کرکے امن و امان قائم کرنے کی انتھک کوششیں کیں۔ انہوں

(۱۲) ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء ۳۰ سال بعد۔پروانہ ردولوی (ص۔ ۲۸۱)

نے دہلی کی مسجد شاہجہانی میں آزادی کے فوراً بعد پہلی تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔

"عزیزو، تبدیلیوں کے ساتھ چلو، یہ نہ کہو کہ ہم اس تغیر کے لئے تیار نہ تھے بلکہ اب تیار ہو جاؤ۔ ستارے ٹوٹ گئے لیکن سورج تو چمک رہا ہے۔ اس سے کرنیں مانگ لو اور ان اندھیری راہوں میں بچھا دو، جہاں اجالے کی سخت ضرورت ہے۔" (۱۳)

مولانا آزاد غیر معمولی حوصلے کے مالک تھے اور مسلمانوں میں بھی بلند حوصلگی کو عام کرنا چاہتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک عظیم انسان ہونے کے ساتھ عظیم سیاسی مبصر بھی تھے۔ ان کی غیر معمولی سیاسی بصیرت کی دلیل یہ ہے کہ وہ کسی قوم پرست اور فرقہ پرست کی مزاحمت، ملامت اور مخالفت کی پرواہ کئے بغیر کانگریس کے اندر رہ کر اس کی قیادت سے بھی بلند ترین سطح سے آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے استقلال کے لئے صحیح بات آخر تک پورے زور و شور سے کہتے رہے۔ اس سلسلے میں انہوں نے گاندھی جی، جواہر لال نہرو اور سردار پٹیل وغیرہ سے بھی مقابلہ کیا۔

مولانا آزاد ہر معاملے میں اپنی آزاد رائے رکھتے تھے۔ وہ انتہائی کشادہ دل اور اولوالعزم انسان تھے۔ ملک کی تقسیم کے بعد بھی وہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود کے لئے کوشاں رہے۔ آزادی کے بعد بھی ملک کی تعمیر و تشکیل میں ان کے تدبر اور سیاسی فہم و فراست کو بہت دخل ہے۔ بلاشبہ ان کی سیاسی بصیرت غیر معمولی تھی۔ انہوں نے ملک کی تقسیم کے بعد جو پیش گوئیاں کی تھیں وہ آج حرف بہ حرف صحیح ثابت ہوتی نظر آرہی ہیں۔ یہاں افسوس کے ساتھ یہ ضرور کہنا پڑتا ہے کہ جس ولولہ اور جوش اشتیاق سے مولانا آزاد نے بیداری قوم کے لئے آزادی سے پہلے مظاہرہ کیا تھا وہ آزادی کے بعد قائم نہیں رہ سکا۔ ملک کی تقسیم کے بعد وہ کسی حد تک مایوس اور مضمحل نظر آنے لگے۔ ان کا ذہنی تدبر و تعقل اور ان کی سیاسی بصیرت یہ محسوس نہ کر سکی کہ ایسے کمیونل ذہنیت اور رجحانات رکھنے والے سیاسی رہنماؤں کے ہندوستان میں پچاس برس بعد مسلمانوں کی حالت بد سے بدترین ہو جائے گی۔ اگر مولانا آزاد نے اپنی غیر معمولی فہم و فراست اور سیاسی بصیرت کو بروئے کار لاکر آزادی کے بعد صرف حقیقی پیشین گوئیوں اور قابل قدر تعلیمی

(۱۳) ہندوستانی مسلمان عصری دستاویزات کے آئینے میں۔ قاضی معزالدین احمد (ص۔ ۲۱)

اقدامات کے علاوہ عملی طور پر ہندوستانی سیاست میں مسلمانوں اور اقلیتوں کے حقوق و تحفظ کے لئے کوئی موثر اقدام کیا ہوتا تو شاید آج بابا امبیڈکر کی قوم مسلمانوں کے سامنے یوں سینہ تان کر نہیں چلتی اور مسلمان آج کے متعصب ہندوستان میں دوسری قوموں کے مقابلے میں اس قدر بے بس اور لاچار ہو کر نہ رہ جاتے۔

۳. سیاسی نظریہ :

مولانا آزاد ملک کے عظیم ترین قومی رہنماؤں میں ایک تھے۔وہ اپنے دور کے سب سے زیادہ ممتاز ،سنجیدہ ،وسیع النظراور انسان دوست سیاسی مفکر تھے۔ان کی رہنمائی صرف ہندوستانی مسلمانوں یا ہندوؤں تک محدود نہیں تھی اور ان کا متحدہ قومیت کا تصور بھی بین الاقوامی طرز فکر کا صرف ایک پہلو تھا۔درحقیقت مولانا آزادعالمی برادری کے قائل تھے۔ان کا سیاسی نقطۂ نظر آفاقی تھا۔ انہوں نے برّ صغیر کی ممتاز سیاسی شخصیتوں‌اور مجاہدین آزادی کے حالات و واقعات کا بغور مطالعہ کیا تھا۔ان ہستیوں سے وہ فیضیاب بھی ہوئے لیکن صحافت،ادب اور مذہب کی طرح سیاست میں بھی انہوں نے اپنی راہ خود نکالی۔

مولانا آزاد عظیم دانشور تھے۔انہیں اسلامی تاریخ،منطق اور فلسفے پرزبردست عبور حاصل تھا لیکن انہوں نے کبھی مذہب اور سیاست میں تفریق نہیں کی۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے مفکرین سے الگ کرتی ہے اور وہ عام سیاستدانوں سے بلند و بالا نظر آتے ہیں۔اپنے سیاسی نقطۂ نظر پرروشنی ڈالتے ہوئے مولانا خود تحریر فرماتے ہیں۔

”ہم نے تو اپنے پولیٹکل خیالات بھی مذہب ہی سے سیکھے ہیں۔ اسلام انسان کے لئے ایک جامع اور اکمل ترین قانون لے کر آیا اور انسانی اعمال کا کوئی مناقشہ ایسا نہیں جس کے لئے وہ حکم نہ ہو۔“(۱)

اس عبارت سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا آزاد سیاست کو مذہب سے الگ تصور نہیں کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی زندگی کی ہر سرگرمی کو مذہب کی کسوٹی پر پرکھا۔ان کے سیاسی فکر و نظرکی توضیح کرتے ہوئے عبدالرزاق ملیح آبادی یوں رقمطراز ہیں۔

---

(۱) مولاناابوالکلام آزاد (ذہن و کردار) عبدالمغنی (ص ـ ۹۷)

"لیکن مولانا خاندان،تربیت ،ماحول کی پابندیوں سے آزاد ہو جانے پر بھی بالکل آزاد نہیں ہو سکتے تھے۔سیاست میں نیشنلزم اور مغرب زدہ جمہوریت سے آگے نہ بڑھ سکے۔کمیونیزم کے برابر مخالف رہے۔۔۔ اس لئے کہ کمیونیزم ان کے مزاج، خاندانی روایات اور ماحول کے لئے بالکل اجنبی تھا"۔(۲)

در اصل مولانا آزاد کا نظریۂ سیاست مذہبی کسوٹی پر کسا ہوا تھا، لہٰذا ان کے سیاسی طرز فکر کو مذہب سے الگ کرکے نہیں دیکھا جا سکتا ۔انہوں نے اسلامی تعلیمات کی روشنی میں ہندوستان کے عصر حاضر کے سیاسی مسائل کا حل تلاش کیا اور اسلام کی روح کو عصر حاضر سے ملانے کی کوشش کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن شیروانی نے جب "الہلال" پر یہ اعتراض کیا کہ اس میں مذہب اور سیاست کی حدیں مل گئی ہیں تو مولانا آزاد نے انہیں جواب میں یہ لکھا۔

"بے شک وہ تعلیم اور پالی ٹکس، جس پر اب تک معلّمین ملّت عامل رہے ہیں،مذہب کے ساتھ ایک دائرے میں نہیں آ سکتے۔ کیونکہ غلامی اور توحید ،حق اور باطل،کفر اور اسلام کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئے۔ لیکن شاید مولانا کی نظر اس پر نہیں گئی کہ "الہلال"جس تعلیم اور پالی ٹکس کی طرف بلاتا ہے وہ تو یکسر قرآن ہی سے ماخوذ ہے اور جب دعوت قرآنی اس کا مقصد ہے،تو لازمی طور پر وہ بھی اس کے دائرۂ بحث میں ہے اورجب تک اسلام دنیا میں باقی ہے، ہمیشہ رہے گا۔"(۳)

در حقیقت مولانا آزاد قرآن حکیم کو مسلمان کی اخلاقی،تمدنی ،معاشی، اور معاشرتی تعلیم کے ساتھ سیاسی تعلیم کا ذریعہ بھی سمجھتے تھے اور سیاست کی تعلیم کو مذہب سے الگ تصور کرنے کو گمراہی سے تعبیر کرتے تھے۔ہندوستان کی جدوجہد آزادی سے متعلق ان کا خیال تھا کہ اسلام توحید کا قائل ہے اور وہ خدا کے سوا کسی کی غلامی کو روا نہیں رکھتا۔ وہ مسلمانوں کو واقعتاً **خلیفتہ اللہ فی الارض** دیکھنا چاہتے تھے۔ چنانچہ انہوں نے مسلمانوں کو "الہلال" کے ذریعے ہندوستان میں انگریزوں کے تسلط سے چھٹکارا پانے کے لئے جہاد کا درس دیا۔ جہاد کے معنی و مفہوم کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے بتایا۔

---

(۲) ذکر آزاد (مولانا آزاد کی رفاقت کے اڑتیس سال) عبدالرزاق ملیح آبادی (ص ۔ ۲۸)

(۳) فکر و نظر۔ سہ ماہی (علی گڑھ) ابوالکلام آزاد نمبر۔ اگست ۱۹۸۹ء مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار۔ عبیدہ اللہ فہد (ص۔۱۴۸)

"جہاد کے معنی یہ ہیں کہ دفع اعداء میں اپنی جان ومال سے کمال درجہ سعی و محنت کرنا۔ کیا دنیا میں کوئی قوم، کوئی ملک، کوئی جماعت، کوئی قبیلہ، کوئی خاندان، کوئی گھر، کوئی انسان بلکہ کوئی وجود اور زندگی بغیر جہاد کے زندہ و قائم رہ سکتی ہے؟ کون ہے جو زندہ رہنا چاہتا ہے اور جہاد نہیں کرتا؟ جس چیز کو تم ہزاروں ناموں اور لفظوں میں بولتے ہو اور کارزار ہستی میں بقاء و قیام کی اصل بیداد سمجھتے ہو، اسی کو اسلام نے ایک جامع لفظ "جہاد" سے تعبیر کیا ہے۔" (۴)

مولانا آزاد جدوجہد آزادی میں مسلمانوں کی شرکت کو دینی فرض اور جہاد فی سبیل اللہ تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں کو تحریک آزادی میں ہر اول دستے کا کردار ادا کرنا چاہئے کیونکہ انہیں دنیا میں خلافت سے نوازا گیا ہے۔ وہ سیاست میں کسی گروہ بندی کے قائل نہیں تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ قرآن کی تعلیم زندگی کے ہر میدان میں انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔ سیاسی گروہ بندی کے سلسلے میں "الہلال" کے ایک قاری کے سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا آزاد نے یوں فرمایا۔

"آپ پوچھتے ہیں کہ آج کل ہندوؤں کے دو پولیٹیکل گروہ موجود ہیں۔ ان میں آپ کس کے ساتھ ہیں؟ گذارش ہے کہ ہم کسی کے ساتھ نہیں ہیں۔ اسلام اس سے بہت ارفع و اعلیٰ ہے کہ اس کے پیروؤں کو اپنی پولیٹیکل پالیسی قائم کرنے کے لئے ہندوؤں کی پیروی کرنی پڑے۔ مسلمانوں کے لئے اس سے بڑھ کر شرم انگیز سوال نہیں ہوسکتا کہ وہ دوسروں کی پولیٹکل تعلیموں کے آگے جھک کر اپنا راستہ پیدا کریں۔ ان کو کسی جماعت میں شامل ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ خود دنیا کو اپنی جماعت میں شامل کرنے والے اور اپنی راہ پر چلانے والے ہیں اور صدیوں تک چلا چکے ہیں۔ وہ خدا کے سامنے کھڑے ہوجائیں تو ساری دنیا ان کے سامنے کھڑی ہوجائے گی۔"(۵)

مولانا آزاد کا سیاسی نقطہ نظر سرتاسر اسلامی تعلیمات پر مبنی تھا۔ وہ زندگی کے ہر شعبے پر دین کا اطلاق کرتے تھے اور اسی روشنی میں اپنے سیاسی طریقۂ کار کا تعین کرتے تھے۔ وہ مذہب اسلام کو پولیٹکل تعلیم کا ارفع و اعلیٰ ذریعہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ دوسروں کی سیاسی تعلیمات پر عمل کرنا غیر اسلامی ہے جسے اسلام کسی بھی صورت میں روا نہیں رکھتا۔ انہیں اپنے مذہب پر

---

(۴) افکار آزاد۔ مرتبہ محمد عثمان فارقلیط (ص۔ ۷۳)

(۵) فکرونظر (سہ ماہی) علی گڈھ ابوالکلام آزاد نمبر اگست ۱۹۸۹ء مولانا ابوالکلام آزاد کے سیاسی افکار۔ عبیداللہ فہد (ص۔ ۱۴۹)

مولانا آزاد اخوت انسانی کے عالمگیر اصولوں کے قائل تھے، جو دراصل اسلام ہی کا عنصر ہے۔ وہ فرقہ وارانہ اتحاد کو محض سیاسی ضرورت ہی نہیں بلکہ مستقل انسانی ضرورت اور انسانیت کی اخلاقی بنیاد تصور کرتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ قومی اتحاد کے بغیر ہندوستان کی تعمیر و ترقی ممکن نہیں ہے۔ ان کا متحدہ قومیت کا تصور محدود نہیں تھا بلکہ اس میں آفاقیت کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ وہ عالمی انسانیت کے قائل تھے۔ ان کے نزدیک دیگر قوموں کا محض نسل و خاندان، رنگ و زبان اور زمین کی جغرافیائی تقسیم کی وجہ سے انسانی رشتہ ختم نہیں ہوجاتا۔ ان کا اصرار تھا کہ مسلمان اسلام کی اصل روح کو سمجھیں اور احکام شرعیہ پر کاربند رہتے ہوئے ہندو بھائیوں سے اتحاد و اتفاق قائم کریں اور ساتھ مل کر آزادی کی جدوجہد میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹائیں۔ ان کے نزدیک یہ فعل عین مذہبی تھا کیونکہ اسلام انسانیت اور آزادی کا درس دیتا ہے۔

مولانا آزاد نے قرآنی تعلیمات کی بنیاد پر اپنے سیاسی اصول متعین کئے اور انہی اصولوں کی روشنی میں انہوں نے متحدہ قومیت، سیکولرازم اور جمہوریت کے تصور کو واضح کیا۔ ملک و قوم کی بیداری کے لئے انہوں نے یہی راہ اپنائی اور مذہب و سیاست کے حسین امتزاج کی مثال دنیا کے سامنے پیش کی۔ مولانا کی یہی خصوصیت انہیں دوسرے مسلمان لیڈروں میں ممتاز کردیتی ہے کہ انہوں نے خالص اسلامی تعلیمات کی بنیاد پر ہندو مسلم اتحاد اور مشترکہ قومیت کے تصور کو اپنایا۔ ان کے سیاسی افکار و خیالات کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ بھی ہوتا ہے کہ وہ سیاست میں مصلحت پسندی کے قائل نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ابتدا ہی میں سر سیّد احمد خان کی مصلحت آمیز دو رخی سیاسی پالیسی سے انحراف کیا۔ سیاست میں مولانا اپنی آزادانہ رائے رکھتے تھے۔ مسئلہ خلافت کے سلسلے میں ایک مرتبہ انہوں نے کہا تھا۔

"اس صحبت میں مجھے جو کچھ عرض کرنا ہے، وہ یہ ہے کہ مسئلہ خلافت کے متعلق جو کچھ ہمارے مطالبات تھے۔ ان میں نہ تو کچھ گھٹا سکتے ہیں، نہ بڑھا سکتے ہیں۔ نہ کوئی قدم پیچھے لے جاسکتے ہیں۔ نہ داہنے لے جاسکتے ہیں نہ بائیں۔ اس میں کسی طرح کے سمجھوتے یا مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔" (۷)

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا آزاد کا سیاسی نقطہ نظر واضح تھا اور وہ اس میں کسی طرح

---

(۷) انتخاب خطبات جمیعتہ العلماء ہند۔ ڈاکٹر شجاعت علی سندیلوی (ص۔۷۶)

کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے۔ انہیں جواہر لال نہرو سے بڑی محبت تھی لیکن سیاسی معاملات میں اگر وہ کوئی غلطی کرتے تو وہ ان کی مخالفت سے بھی گریز نہ کرتے تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد آہنی عزم کے مالک تھے۔ سیاست کی خارزار وادی میں انہیں بے شمار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ملک کی سیاسی کروٹوں نے انہیں شدید بے چینی اور اضطراب میں مبتلا کیا۔ وہ علماء کے طعن و تشنیع کا شکار بھی ہوئے اور مسلمانوں کی دشنام طرازیاں بھی انہیں سہنی پڑیں لیکن انہوں نے اپنے اصولوں سے کبھی انحراف نہیں کیا۔ انہیں وطن اور انسانیت دونوں سے بے انتہا محبت تھی۔ ایک مرتبہ انہوں نے محمد علی جناح کے طنز و تضحیک پر کہا تھا۔

"جناح مجھے کیا سمجھتا ہے، مجھے اس کی مطلق پرواہ نہیں ۔ نہ ہی اس کی آواز مسلمانوں کی آواز ہے۔ مجھے اپنا وطن زیادہ عزیز ہے اور اس قسم کے سستے اور رکیک جملے مجھے مشتعل نہیں کرسکتے۔" (۸)

مولانا آزاد اپنی دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے کبھی ذاتیات کو سیاست میں اثر انداز نہیں ہونے دیا بلکہ سیاست کو وسیع تناظر میں دیکھا۔ مصیبتوں اور تکلیفوں سے گھبرا کر انہوں نے کبھی راہ فرار اختیار نہیں کی اور نہ ہی برطانوی حکومت سے خوفزدہ ہو کر سپر انداز ہوئے۔ وہ اتنے جری اور بہادر تھے کہ اپنے اصولوں کی خاطر بڑے سے بڑے حریف کو چیلنج کرسکتے تھے۔ ہندوستانی پارلیمنٹ میں پرشوتم داس ٹنڈن کو ایک مرتبہ انہوں نے بڑے سخت لہجے میں واضح اور دو ٹوک جواب دیتے ہوئے کہا تھا۔

"میری پوری زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب ہے۔ میں بے غرض ہوں اور جو بے غرض ہوتا ہے، بے پناہ ہو جاتا ہے اور بے پناہ وہ ہوتا ہے، جسے کوئی تلوار کاٹ نہیں سکتی۔" (۹)

مولانا آزاد واقعی بے پناہ تھے۔ ان کی خدمات کا احاطہ کرنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ انہوں نے ایک مرد مجاہد کی طرح اپنے خواب کی تکمیل کے لئے اپنی زندگی وقف کردی۔ جواہر لال نہرو نے "ڈسکوری آف انڈیا" میں ان کے سیاسی نظریات پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا تھا۔

---

(۸) ایوان اردو (دہلی) مولانا ابوالکلام آزاد نمبر۔ دسمبر ۱۹۸۸ء مولانا آزاد کی سیاسی بصیرت۔ م۔م۔ راجندر (ص۔۱۳۸)

(۹) فکر و نظر (سہ ماہی) علی گڈھ۔ ابوالکلام آزاد نمبر اگست ۱۹۸۹ء مولانا ابوالکلام آزاد کی سیاسی عظمت۔ محمد یٰسین (ص۔۱۰۴)

"اسلام کی صحیح روایات میں رچے ہوئے مولانا آزاد اپنی علمی بصیرت اور فضیلت سے اسلامی ممالک میں غیر معمولی شہرت رکھتے تھے۔۔۔ انہوں نے ترکی اور دوسرے ممالک میں حریت کی آواز بلند ہوتے دیکھی تھی۔ اس لئے ان کا نظریۂ سیاست پرانے مسلمان لیڈروں سے جدا گانہ تھا۔ انہوں نے مذہبی تنگ نظری سے کام نہیں لیا۔۔۔ مولانا آزاد نے "الہلال" میں مسلمانوں سے ایک نئی زبان میں خطاب کیا۔ صرف ان کے خیالات اور نقطہ نظر ہی میں جدت نہیں تھی بلکہ ان کی تحریر کا رنگ بھی نیا تھا۔۔۔ ان کا ذہن عہد وسطٰی کے خیالات، اٹھارویں صدی کی عقلیت اور جدید رجحانات کا ایک دل آویز مرکب تھا۔" (۱۰)

درحقیقت مولانا آزاد نے اپنے دور کے ملک کی تاریخی اور سیاسی صورتحال کو خالص اسلامی نقطہ نظر سے قرآن حکیم کے ارشادات کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کی۔ اسی روشنی میں انہوں نے متحدہ قومیت کے تصور کو واضح کیا اور اس کا سرا عالم انسانیت سے ملا دیا۔ انہوں نے مذہب کو سیاست سے مربوط کرنے کی کوشش کی۔ مولانا آزاد کی ان تمام کوششوں اور کاوشوں میں ان کی غیر معمولی ذہانت، منطق، اجتہاد فکر اور جرأت عمل کو بڑا دخل ہے۔ انہوں نے مذہبی معاملات کی طرح سیاست میں بھی اعتدال اور توازن کی راہ اختیار کی اور قومی نظریات پر عمل پیرا ہوئے۔ ان کی یہی خصوصیت انہیں ان کے ہم عصر سیاسی مفکرین سے جدا کردیتی ہے اور وہ عظیم سیاسی رہنما کی صورت میں ابھر کر سامنے آتے ہیں۔

مولانا آزاد کی فہم و فراست، گہری سوجھ بوجھ اور سیاسی بصیرت اتنی دور رس تھی کہ وہ قطرہ میں دجلہ دیکھ لیتے تھے۔ انہوں نے اپنی پوری زندگی تحریک آزادی میں ملک کی رہنمائی کے لئے صرف کردی تھی۔ مثال کے طور پر ۱۹۱۲ء سے پہلے کا زمانہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مسلمان سیاسی جدوجہد سے بالکل الگ تھلگ رہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ جدوجہد آزادی صرف ہندوؤں کے لئے مخصوص ہے۔ اس زمانے میں مسلم لیگ ضرور قائم ہوئی لیکن اس کا نصب العین بھی یہی تھا کہ ہندوؤں کی سیاسی ترقی کو روکا جائے اور حکومت وقت کے ہاتھ مضبوط کئے جائیں۔ غرض یہ کہ ہندوؤں کی سیاسی جدوجہد کی ہر طرح سے مخالفت کی جائے لیکن ایسے نامساعد حالات میں بھی مولانا آزاد نے اپنی ژرف نگاہی، دور اندیشی اور مبصرانہ صلاحیت سے "الہلال" کے

---

(۱۰) مولانا ابوالکلام آزاد (شخصیت، سیاست اور پیغام) رشید الدین خان (ص ۔ ۱۳۸)

HANSA MEHTA LIBRARY
M.S. University Baroda

ذریعے بہت کم مدت میں مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کیا اور ان میں سیا... کردی۔ یہاں تک کہ وہ ملک کی آزادی کی جدوجہد میں ہندوؤں کے دوش بدوش ... اور تاریخ گواہ ہے کہ آزادی کی راہ میں مسلمانوں کی قربانی دیگر قوموں کے مقابلے میں ہر اعتبار سے مقدم ہے۔

ہندوستان کی انتہائی نازک سیاسی صورتحال میں مولانا آزاد نے جواہر لال نہرو کو کانگریس کی صدارت سونپ کر ہمالیائی غلطی کی جس کی وجہ سے ہندوستان کے حالات ان کی دسترس سے باہر ہوگئے۔ ہندوستان تو آزاد ہوگیا لیکن اس کی وحدت گم ہوگئی اوران کے خوابوں کا شیش محل ٹوٹ کر چکنا چور ہوگیا۔ یہاں یہ بات ضرور کھٹکتی ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد مولانا آزاد اتنے فعّال سیاسی رہنما نظر نہیں آتے، جتنے کہ وہ آزادی سے پہلے تھے۔ آزادی کے بعد ان کے سیاسی کردار کا جائزہ لینے سے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے ان کی خود اعتمادی چکنا چور ہوگئی ہو اور وہ اپنی زندگی کے آخری وقت تک شکست خوردہ نظر آتے ہیں۔ اگر ان کی سیاسی رہنمائی، مسلمانوں کو پہلے ہی کی طرح حاصل رہتی تو شاید ہندوستان میں ان کی سیاسی، معاشی، اقتصادی اور معاشرتی حالت اس قدر ابتر نہ ہوتی۔ اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اس تشویش ناک صورتحال کی ذمہ داری خود مسلمانوں کی بے حسی، کم علمی اور بداخلاقی پر بھی عائد ہوتی ہے لیکن بحیثیت قومی رہنما، مولانا آزاد وہ بھی نہیں کرسکے جو ڈاکٹر بابا صاحب امبیڈکر نے اپنی قوم کے تحفظ کے لئے کر دکھایا۔ بظاہر اس کی وجہ یہ نظر آتی ہے کہ ان کے ساتھ سرسید احمد خان کی طرح ان کی تحریک کو تقویت اور استحکام بخشنے والی دانشور جماعت نہیں تھی۔ مولانا آزاد اپنی فطری افتاد طبع کی وجہ سے ہمیشہ تنہا ہی رہے اور وطن میں رہ کر بھی انہوں نے غریب الوطنی کی زندگی گذار دی۔

مجموعی اعتبار سے دیکھا جائے تو آزادی سے کچھ پہلے اور آزادی کے بعد ہندوستان کے سیاسی حالات نے اس طرح کروٹ پر کروٹ بدلی کہ حالات مولانا آزاد کے قابو سے باہر ہوگئے اور وہ بے بس اور لاچار ہو کر رہ گئے۔ ان تمام باتوں سے قطع نظر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ مولانا آزاد ایک عظیم انسان ہونے کے ساتھ انتہائی دور اندیش، وسیع النظر، کشادہ قلب اور غیر معمولی سیاسی بصیرت کے مالک تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہندوستان کے متعصب سیاسی رہنماؤں نے ان کا ساتھ نہیں دیا لیکن ان کا تشکیل کردہ سیاسی نصب العین آج بھی ملک و قوم کے لئے مشعل

راہ ہے۔ ان کے سیاسی نظریات آج بھی برصغیر کے مسلمانوں اور ابن الوقت سیاسی رہنماؤں کو دعوت غور و فکر دے رہے ہیں۔